2014 کے دوران بین الاقوامی مذہبی آزادی کی رپورٹ--پاکستان

اہم نکات کا خلاصہ

آئین میں اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دیا گیا ہے اور اس کے تحت ضروری ہے کہ قوانین اسلام کے مطابق ہوں۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ "قانون، امنِ عامہ اور اخلاقیات کے تابع رہتے ہوئے ہر شہری کو اپنے مذہب کو اعلانیہ اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی ہو گی"۔ انسانی حقوق کی ملکی اور بین الاقوامی تنظیموں کے مطابق، مذہبی آزادی کی خلاف ورزیوں کے ذمہ دار لوگوں کے خلاف تفتیش کرنے، انہیں گرفتار کرنے، اور ان پر مقدمہ چلانے میں عام طور سے حکومت کی ناکامی کی وجہ سے، قانونی مواخذے سے مبرا اور دیدہ دلیری کا ماحول قائم ہوا، اور عدم رواداری اور تشدد کی کارروائیوں کو فروغ ملا۔ حکومت کی پالیسیوں نے اقلیتی مذہبی گروپوں کے ارکان کو برابر کا تحفظ فراہم نہیں کیا، اور توہینِ مذہب اور ایسے امتیازی قوانین کی وجہ سے جن کا مقصد احمدیہ مسلم کمیونٹی کو بے حیثیت کرنا تھا، اقلیتیں اکثر اپنے مذہبی عقائد پر آزادی سے عمل کرنے میں خوف محسوس کرتی تھیں۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن (HRCP) کے مطابق، اس سال کے دوران پولیس نے توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت، 12 نئے مقدمے درج کیے، اور عدالتوں نے توہینِ مذہب کے جرم میں تین افراد کو سزائے موت، چھ افراد کو عمر قید، اور تین کو دو سال قید کی سزا سنائی۔ حکومت نے اس سال کے دوران توہینِ مذہب کے جرم میں کسی سزائے موت پر عمل نہیں کیا۔ حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اقلیتوں کے لیے ایک قومی کونسل قائم کرے گی جس میں عیسائی، ہندو، مسلمان، اور سکھ نمائندے شامل ہوں گے۔

بلوچستان میں ہزارہ نسل کے شیعوں کے خلاف پورے سال حملے جاری رہے۔ شیعہ مسلمانوں اور ان لوگوں کو جن پر توہینِ مذہب کے الزامات تھے، چن چن کر ہلاک کیا گیا۔ معاشرے میں، ہجوموں کے حملوں، توہینِ مذہب کے الزامات، اور پُر تشدد انتہا پسندانہ سرگرمیوں کے رجحانات برقرار رہے۔ ملک کے بعض حصوں میں، پُر تشدد انتہا پسندوں نے ایسے شہریوں کو دھمکیاں دیں جو ان کے عقیدے کے مطابق اسلام کی مخصوص کٹر شکل پر عمل نہیں کرتے تھے۔

امریکی سفارت خانے اور کونسلیٹس جنرل نے وزرا، دوسرے اعلیٰ عہدے داروں، پارلیمینٹ اور سول سوسائیٹی کے ارکان، سمیت حکومت سے نیز تمام مذہبی گروپوں کے لیڈروں اور اقلیتی کمیونٹی کے نمائندوں کے ساتھ باقاعدگی سے تبادلۂ خیال جاری رکھا جس کا مقصد مذہبی آزادی، رواداری اور اتفاق و ہم آہنگی کی حوصلہ افزائی کرنا اور مخصوص توجہ طلب امور پر بات چیت کرنا تھا۔ ان امور میں توہینِ مذہب کے قوانین؛ سرکاری تعلیمی اداروں اور مدرسوں کے نصاب میں اصلاح؛ احمدی، عیسائی، ہندو، سکھ، اور دوسری اقلیتی کمیونٹیوں کے ساتھ برتاؤ؛ فرقہ وارانہ تشدد؛ اور مذہبی گروپوں کے تحفظ اور ان کے ساتھ رابطے کو بہتر بنانے کے طریقے شامل ہیں۔

پاکستان

سیکشن I۔ مذہبی بنیاد پر آبادی کے اعداد و شمار

امریکی حکومت کے اندازے کے مطابق پاکستان کی کُل آبادی 19 کروڑ 62 لاکھ ہے (جولائی 2014 کا اندازہ)۔ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق جو 1998 میں ہوئی تھی، 95 فیصد آبادی مسلمان ہے (سرکاری طور پر 75 فیصد مسلمان آبادی کو سُنّی اور بقیہ 25 فیصد کو سرکاری طور پر شیعہ درج کیا گیا ہے)۔ ملک میں اندازاً بیس سے چالیس لاکھ احمدی اور 500,000 سے 800,000 تک ذکری مسلمان بھی ہیں۔ سرکاری طور پر آبادی کے بقیہ 5 فیصد حصے میں ہندو، عیسائی، پارسی / زرتشت کے پیروکار، بہائی، سکھ، بودھ، اور دوسرے گروپ شامل ہیں۔ دوسرے مذہبی گروپوں میں کالاش، کیہال اور جین شامل ہیں۔ ایک یہودی کی موجودگی کا علم ہے۔ کُل آبادی میں 0.5 فیصد سے کم لوگ اپنی مذہبی وابستگی کے بارے میں خاموش رہے یا انھوں نے دعویٰ کیا کہ ان کا تعلق کسی مذہبی گروپ سے نہیں ہے۔

سیکشن II ۔ حکومت کی جانب سے مذہبی آزادی کے احترام کی صورت حال

قانونی دائرۂ کار

آئین میں کہا گیا ہے کہ تمام شہروں کے لیے اس مقصد سے مناسب قوانین بنائے جائیں گے کہ وہ اپنے مذہب کو اعلانیہ اختیار کر سکیں، اس پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "ہر شہری کو اپنا مذہب اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہو گا"۔ تاہم، آئین کی دوسری شقوں اور قوانین کے ذریعے، اس حق کی حدود متعین کی گئی ہیں اور یہ حق "قانون، امنِ عامہ ، اور اخلاقیات کے تابع ہے۔"

آئین اور تعزیراتِ پاکستان کے مطابق، احمدی مسلمان نہیں ہیں اور انہیں اپنے آپ کو مسلمان کہنے، اپنے عقائد کو اسلام کہنے، اپنے مذہبی عقیدوں کی تبلیغ یا تشہیر کرنے، دوسروں کو احمدی تعلیمات کو قبول کرنے کی دعوت دینے یا مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی توہین کرنے کی ممانعت ہے۔ ان شِقوں کی خلاف ورزی کی سزا، تین سال تک قید اور جرمانہ ہے۔

حکومت نے مذہبی رجحانات رکھنے والے ایسے کئی گروپوں کی سرگرمیوں کو اور ان کی رکنیت پر پابندی عائد کر دی ہے، جنہیں وہ "انتہا پسند" یا "دہشت گرد" قرار دیتی ہے۔ ایسے بہت سے خلاف قانون گروپوں کی سرگرمیاں برقرار ہیں، اور بعض گروپ پابندی عائد کیے جانے کے بعد، اپنا نام تبدیل کر لیتے ہیں اور اس طرح قانون کے مواخذے سے بچ جاتے ہیں۔

پاکستان

قانون حکومت کو ایسے مقدمات چلانے کے لیے تیزی سے کام کرنے والی خصوصی عدالتوں سے کام لینے کی اجازت دیتا ہے، جن کا تعلق پُر تشدد جرائم، دہشت گردی کی سرگرمیوں، اور توہینِ مذہب سمیت ایسی کارروائیوں یا تقریروں سے ہو جن کے بارے میں یہ سمجھا گیا ہو کہ ان کا مقصد مذہبی منافرت کو ہوا دینا تھا۔

حکومت، سِول یا غیر روایتی شادی کو تسلیم نہیں کرتی۔ شادیاں عموماً افراد کے اپنے مذہبی عقائد اور رسومات کے مطابق انجام پاتی ہیں اور انہیں اُن کے مذہبی گروپ کے مطابق رجسٹر کیا جاتا ہے۔ تاہم حکومت کے پاس ہندوؤں اور سکھوں کی شادیوں کو رجسٹر کرنے کے لیے کوئی قانونی طریقۂ کار موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے ان مذہبی گروپوں کی عورتوں کو وراثت، صحت کی سہولتوں تک رسائی، ووٹ ڈالنے، پاسپورٹ حاصل کرنے، اور جائداد کی خرید و فروخت میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غیر مسلم مردوں کی شادیاں اُن کے اسلام قبول کر لیے جانے کے بعد بدستور قانونی شادیاں رہتی ہیں۔ اگر کسی غیر مسلم عورت نے اسلام قبول کر لیا ہو اور اس کی شادی اس کے سابق مذہب کے مطابق ہوئی ہو، تو حکومت اُس کی شادی کو منسوخ سمجھتی ہے۔ ایسی غیر مسلم عورتوں کے بچّوں کو، جنہوں نے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا ہو، ناجائز سمجھا جاتا ہے اور اس لیے وہ وراثت کے اہل نہیں سمجھے جاتے۔ ایسی شادی کو جائز حیثیت دینے اور بچّوں کو جائز اولاد قرار دینے کا واحد راستہ یہ ہے کہ شوہر اسلام قبول کر لے۔ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے والے مسلمان مرد اور عورت کے بچّوں کو ناجائز اولاد سمجھا جاتا ہے اور حکومت بچّوں کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔

جیسا کہ تعزیراتِ پاکستان میں درج ہے، آزادیٔ تقریر، "اسلام کی عظمت کے مفاد میں معقول پابندیوں کے تابع ہے"۔ ملک کے توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت، "پیغمبرِ اسلام کی بے حرمتی کرنے" پر سزائے موت"، قران کو بُرا بھلا کہنے، نقصان پہنچانے یا اس کی بے حرمتی کرنے پر "عمر قید اور کسی "دوسرے فرد کے مذہبی جذبات کی توہین کرنے پر" 10 سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ تقریر سمیت کوئی بھی ایسا کام کرنے پر، جس کا مقصد مذہبی منافرت کو بھڑکانا ہو، سات سال قید تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔

مشنری اداروں کو ملک میں کام کرنے کی اجازت ہے اور وہ اس شرط کے ساتھ لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر سکتے ہیں کہ وہ اسلام کے خلاف کوئی تبلیغ نہ کریں اور یہ تسلیم کریں کہ وہ خود مسلمان نہیں ہیں (اس طرح احمدیوں کو اس شق سے علیحدہ کر دیا گیا ہے)۔ غیر ملکی مشنری اداروں کے ارکان کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے پاس دو سے پانچ سال تک ملک میں قیام کے لیے خصوصی ویزے ہوں اور انہیں سال میں ایک بار ملک میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ صرف ملک سے واپس جانے والے مشنری ارکان کی "جگہ پُر کرنے" کے لیے نئے ویزے جاری کیے جاتے ہیں۔

حکومت عام طور سے مذہبی مواد کی اشاعت پر پابندی عائد نہیں کرتی؛ تاہم احمدیوں کے مذہبی لٹریچر کی فروخت ممنوع ہے۔ قانون کے تحت اسلام یا اس کے پیغمبروں کے بارے میں کسی قسم کی تنقید اور دوسروں کے مذہبی عقائد کی توہین کرنا ممنوع ہے۔

پاکستان

حکومت پاسپورٹوں میں مذہبی وابستگی کا اندراج کرتی ہے اور قومی شناختی کارڈ کی درخواستوں میں مذہبی معلومات طلب کی جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو مسلمان کی حیثیت سے اپنے نام درج کرانے کے خواہش مند ہوں، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اس عقیدے کا حلف اُٹھائیں کہ پیغمبرِ اسلام آخری رسول ہیں اور ایک جھوٹے نبی کے طور پر احمدیہ تحریک کے بانی اور غیر مسلموں کے طور پر اُن کے پیروکاروں کی لازماً مذمّت کریں۔ یہ ایک ایسی شق ہے جس کی وجہ سے احمدی قانونی دستاویزات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس شق سے اس کمیونٹی کے ارکان پر دباؤ پڑتا ہے کہ وہ اپنے عقائد سے منکر ہو جائیں تاکہ ووٹ دینے کے حق سمیت، جس کے لیے شناختی کارڈ ضروری ہے، شہریت کے دوسرے حقوق سے مستفید ہو سکیں۔

آئین میں "مذہبی اداروں کا انتظام چلانے کی آزادی" فراہم کی گئی ہے۔ اصولی طور پر حکومت منظم مذہبی گروپوں کو عبادت گاہیں قائم کرنے اور اُن کے مذہبی عملے کو تربیت دینے سے نہیں روکتی۔ احمدیوں کی عبادت گاہوں کی تعمیر پر کوئی سرکاری پابندی عائد نہیں ہے، تاہم، احمدیوں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ انہیں مسجدیں کہہ سکیں۔

مذہبی اقلیتوں کی اُن املاک کی دیکھ بھال، جنہیں 1947 میں برطانوی ہند کی تقسیم کے دوران اقلیتی لوگ چھوڑ کر چلے گئے تھے، قانونی طور پر وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہے۔ حکومت تمام سُنّی مسلمانوں سے 2.5 فیصد کی شرح سے زکوٰۃ (ٹیکس) جمع کرتی ہے اور اس رقم کو سُنّیوں کی مسجدوں، مدرسوں اور فلاحی اداروں میں تقسیم کرتی ہے۔

قانون کے تحت یہ ضروری نہیں ہے کہ افراد کسی مذہب پر عمل پیرا ہوں یا کسی مذہبی گروپ سے برائے نام وابستہ ہوں۔ آئین کے تحت صدر اور وزیرِ اعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ پارلیمینٹ کے ارکان سمیت تمام اعلیٰ عہدے داروں کو ملک کی اسلامی شناخت کی حفاظت کرنے کا حلف اٹھانا لازمی ہے۔

نظامِ انصاف میں متعدد مختلف عدالتی نظاموں کو اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ عدالتوں کے دائرہ اختیارات بعض اوقات ایک دوسرے کے اختیارات کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور کہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ متصادم ہیں۔ اس چیز سے دیوانی، فوجداری اور اسلامی قوانین کے درمیان اختلافات کی عکاسی ہوتی ہے۔ زنا بالجبر، غیر زوجی جنسی تعلقات، شراب نوشی اور جوئے سمیت، بعض جرائم پر فوجداری عدالتوں میں سنائی جانے والی سزاؤں کے خلاف، وفاقی شرعی عدالت (FSC) اور سپریم کورٹ کے شریعت بینچ دونوں میں ، اپیل دائر کی جا سکتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت ان معاملات میں اپنے "نظرِ ثانی کے اختیار" کو (وہ اختیار جس کے تحت وہ خود اپنی صوابدید پر زیریں عدالتوں کے کیسوں کا جائزہ لے سکتی ہے) استعمال کرتی ہے۔ یہ وہ اختیار ہے جس کا اطلاق اس قسم کے کیسوں پر ہوتا ہے، چاہے ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلموں سے۔ غیر مسلموں کو ، اگر وہ چاہیں تو، ایسے معاملات میں وفاقی شرعی عدالت سے صلاح مشورہ کرنے کی اجازت ہے، جن کا ان پر اثر پڑتا ہو یا جن سے ان کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

پاکستان

مذہبی امور اور بین المذاہب ہم آہنگی کی وزارت، حج اور دوسرے اسلامی مقدس مقامات کی زیارتوں میں شرکت کے انتظامات کی ذمہ دار ہے۔ حکام توہینِ مذہب اور اسلامی تعلیم جیسے دوسرے معاملات کے بارے میں بھی اس وزارت سے صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ اس وزارت کے کل بجٹ سے ضرورت مند اقلیتوں کی امداد، اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی مرمت، اقلیتوں کے زیرِ اہتمام چلنے والے چھوٹے چھوٹے ترقیاتی منصوبوں کے قیام اور اقلیتوں کے مذہبی تہواروں کے اخراجات، اور مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کو تعلیمی وظائف بھی ادا کیے جاتے ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر افراد کو امتیازی سلوک سے تحفظ فراہم کرنا قانون، انصاف اور انسانی حقوق کی وزارت کی ذمہ داری ہے، تاہم وفاقی حکام آئین کے تحت یہ ذمہ داری بڑی حد تک صوبائی حکومتوں کو تفویض کر دیتے ہیں۔

سرکاری اسکولوں میں تمام مسلمان طلبا کے لیے اسلامیات کا مضمون لازمی ہے۔ اگرچہ قانونی طور پر دوسرے مذہبی گروپوں کے طالب علموں کے لیے اسلامیات پڑھنا ضروری نہیں ہے، لیکن عام طور پر انہیں اسلامیات کی بجائے اُن کے اپنے مذہبی عقائد کے مطالعے کی سہولت پیش نہیں کی جاتی اور انہیں اسلامیات کی کلاس لینی پڑتی ہے۔ کچھ اسکولوں میں غیر مسلم طلبا اخلاقیات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ والدین اپنے خرچ پر بچوں کو مذہبی اسکولوں سمیت پرائیویٹ اسکولوں میں بھیج سکتے ہیں۔ پرائیویٹ اسکول عموماً مذہبی تعلیم فراہم کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں آزاد ہیں، تاہم مبینہ طور پر، ان پر اکثر اسلامیات پڑھانے کے لیے حکومت کی طرف سے دباؤ ہوتا ہے۔ آئین میں حکومت کے کسی بھی تعلیمی ادارے میں مذہبی وابستگی کی بنیاد پر طلبا کے داخلے میں امتیازی سلوک کی خاص طور سے ممانعت کی گئی ہے۔ حکومت کے عہدے داروں کا کہنا ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے پر اثر انداز ہونے والے عوامل صرف طلبا کے گریڈ اور اُن کے آبائی صوبے ہوتے ہیں۔ تاہم طالب علموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی درخواستوں میں لازمی طور پر اپنی مذہبی وابستگی کو ظاہر کریں۔ اس چیز کا تقاضہ یونیورسٹیوں سمیت، پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی کیا جاتا ہے۔ وہ طالب علم جو خود کو مسلمان قرار دیتے ہیں،، اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ تحریری طور پر اس عقیدے کا اعلان کریں کہ وہ پیغمبرِ اسلام کو آخری نبی مانتے ہیں، اس طرح احمدیوں کو عام مسلمانوں سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی مقامی مذہبی کمیونٹی کے سربراہ سے اپنی مذہبی وابستگی کی تصدیق کرائیں۔

مسلمان علماء کے زیرِ انتظام چلنے والے پرائیویٹ اسکولوں یا مدرسوں میں اپنے نصابوں اور دوسری خصوصیات کے معاملے میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ بعض دیہی علاقوں میں، سرکاری اسکولوں تک رسائی مشکل ہو سکتی ہے یا ان کی حالت خراب ہو سکتی ہے۔ اس طرح ان غریب طالب علموں کے لیے عملی طور پر مدرسے ہی تعلیم حاصل کرنے کا واحد وسیلہ ہیں۔ قانون کے تحت، مدرسوں کو فرقہ وارانہ یا مذہبی منافرت کی تعلیم دینے یا فرقہ وارانہ یا مذہبی تشدد کی حوصلہ افزائی کرنے کی ممانعت ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران کچھ بااثر مدرسوں نے، جو اگرچہ تھوڑی تعداد میں تھے، قانون کی خلاف

پاکستان

ورزی کرتے ہوئے دہشت گردی کی حمایت میں انتہاپسند نظریات کی تعلیم دی ہے۔ قانون کے تحت ضروری ہے کہ تمام مدرسے پانچ غیر سرکاری وفاقوں میں سے کسی ایک وقف (غیر سرکاری بورڈ) کے ساتھ یا براہ راست حکومت کے پاس خود کو رجسٹر کرائیں، بیرونی ملکوں سے مالی امداد لینا بند کر دیں اور غیر ملکی طلبا کو صرف اُن کی حکومتوں کی رضامندی کے ساتھ قبول کریں۔ حکومت نے سرکاری طور پر بیشتر مدرسوں کو "غیر انتہاپسند اداروں" کی کیٹیگری میں شامل کیا ہے۔

قومی اسمبلی میں اور صوبائی اسمبلیوں دونوں میں، مذہبی اقلیتی ارکان کے لیے نشستیں محفوظ ہیں۔ 342 ارکان کی قومی اسمبلی میں مذہبی اقلیتوں کے لیے 10 نشستیں ہیں۔ 104 نشستوں والی سینیٹ میں ہر صوبے کی ایک نشست کی بنیاد پر مذہبی اقلیتوں کی چار نشستیں ہیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں، اقلیتوں کے لیے خیبر پختونخواہ میں تین، پنجاب میں آٹھ، سندھ میں نو اور بلوچستان اسمبلی میں تین نشستیں مخصوص ہیں۔

حکومت کا اندازِ کار

حکومت کی پالیسیوں کے تحت اقلیتی اور اکثریتی مذہبی گروپوں کے ارکان کو برابر کا تحفظ فراہم نہیں کیا گیا، اور امتیازی قانون سازی کی وجہ سے، اقلیتیں اکثر اپنے مذہبی عقائد کا اعلانیہ اظہار کرنے سے ڈرتی رہیں۔ میڈیا اور غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) نے پولیس کے ہاتھوں مذہبی اقلیتوں کی ہلاکتوں کی اطلاعات دیں۔ اقلیتوں نے یہ بھی کہا کہ عدلیہ نے، خاص طور سے توہینِ مذہب سے متعلق مقدمات میں، مذہبی اقلیتوں کے خلاف جانبداری سے کام لیا۔

انسانی حقوق کی ملکی اور بین الاقوامی تنظیموں کے مطابق، معاشرے میں ناانصافیوں اور زیادتیوں کے ذمہ دار لوگوں کے خلاف تفتیش کرنے، انہیں گرفتار کرنے، یا ان پر مقدمہ چلانے میں عام طور سے حکومت کی ناکامی کی وجہ سے، قانونی مواخذے سے مبرا اور دیدہ دلیری کا ماحول قائم ہوا، اور عدم رواداری اور تشدد کی کارروائیوں کو فروغ ملا۔ سال کے دوران، متعدد کیسوں میں حکام ایسے لوگوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے جنہیں مذہبی محرکات کی بنا پر ہجوم نے تشدد کا نشانہ بنایا۔

پریس اور انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق، 25 ستمبر کو راولپنڈی کے اڈیالہ جیل میں ایک پولیس افسر نے ذہنی طور پر مریض ایک برطانوی شہری محمد اصغر کو، جسے پاکستان کے توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت موت کی سزا سنائی گئی تھی، گولی مار کر زخمی کر دیا۔ جیل کے حکام نے اس کانسٹبل اور جیل کے چار دوسرے عہدے داروں کو، جن پر اپنے فرائض کی انجام دہی میں غفلت کا شبہ تھا، گرفتار کر لیا۔ ابتدائی تفتیش سے پتہ چلا کہ اس جرم میں شریک ملزموں نے پولیس افسر کو جیل کے اندر کوئی ہتھیار لے جانے کی اجازت دی، اصغر کی نشاندہی کی، اور پھر اسے گولی مار دی۔

پاکستان

6 نومبر کو، لاہور میں ایک پولیس افسر نے شیعہ برادری کے ایک رکن، طفیل حیدر کو ہلاک کرنے کے لیے ایک کلہاڑی استعمال کی۔ حیدر کو مبینہ طور پر توہینِ مذہب کا ارتکاب کرنے پر جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

سال کے دوران، افراد کی طرف سے سرکاری عہدے داروں اور میڈیا کی شخصیتوں کے خلاف توہینِ مذہب کے الزامات عائد کیے جاتے رہے، اور حکام نے ان الزامات کی بنیاد پر فوجداری مقدمات شروع کیے اور ان پر کاروائی کی۔ 28 اکتوبر کو، متحدہ قومی موومنٹ (MQM) کے سیاستدانوں نے حزبِ اختلاف کی پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کے لیڈر سید خورشید کے خلاف توہینِ مذہب کی ایک عرضداشت درج کرائی۔ خورشید پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے ایک مقبرے کی زیارت کے دوران ایسے بیانات دیے جو توہین مذہب کے زمرے میں آتے ہیں۔ ملک کی سابق وزیرِ اطلاعات اور امریکہ میں پاکستان کی سابق سفیر، شیری رحمان کے خلاف توہینِ مذہب کا ایک مقدمہ چلتا رہا۔ رحمان پر الزام تھا کہ انھوں نے 2010 میں ایک ٹیلیویژن انٹرویو کے دوران ایسی باتیں کہیں جو توہینِ مذہب کے دائرے میں آتی ہیں۔ نومبر میں، گلگت-بلتستان کی ایک عدالت نے اداکارہ وینا ملک اور ان کے شوہر، اسد بشیر خان کو ایک نشریے کے دوران توہینِ مذہب کا ارتکاب کرنے پر 26 سال قید کی سزا دی۔ عدالت نے جنگ-جیو نیٹ ورک کے مالک میر شکیل الرحمان کو بھی جن کے نیٹ ورک پر یہ شو دکھایا گیا تھا، یہی سزا دی۔ 10 دسمبر کو، سپریم کورٹ نے ایک عبوری حکم جاری کیا جس کے تحت گلگت-بلتستان کی عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد معطل کر دیا گیا۔

احمدیہ کمیونٹی کے لیڈر، حکام کی جانب سے احمدیوں کو توہین مذہب، "احمدیہ مخالف قوانین" کی خلاف ورزی، یا دوسرے جرائم کے الزامات کا نشانہ بنانے اور ہراساں کرنے پر مسلسل تشویش کا اظہار کرتے رہے۔ قانون کی ان شقوں کے مبہم الفاظ کی وجہ سے، جن کے تحت احمدیوں کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر خود کو مسلمان ظاہر کرنا ممنوع ہے، سرکاری عہدے داروں کے لیے عام بول چال کے خیر مقدمی کلمات استعمال کرنے، اور اپنے بچوں کا نام محمد رکھنے پر، احمدیوں کے خلاف الزامات عائد کرنا ممکن ہو گیا۔ احمدیہ لیڈروں کے مطابق، حکام نے 24 احمدیوں پر آٹھ مختلف کیسوں میں الزامات عائد کیے جن کا تعلق بڑی حد تک "احمدیہ مخالف قوانین" سے تھا۔ پولیس نے 13 احمدیوں پر الگ الگ کیسوں میں قرآن کی مبّینہ بے حرمتی کا الزام عائد کیا۔

نظامِ انصاف کے تحت توہینِ مذہب کے مقدمات میں کارروائی کے دوران، زیریں عدالتیں اکثر قانونِ شہادت کے بنیادی معیاروں کی پابندی میں ناکام رہیں۔ اس کے نتیجے میں، سزا پانے والے بعض افراد کو برسوں جیل میں گذارنے پڑے جب کہ بعد میں اعلیٰ عدالتوں نے ثبوت کے فقدان کی بنا پر ان کی سزایابی کو منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ انہیں رہا کر دیا جائے۔ زیریں عدالتوں میں مقدمات کی کارروائی متشدد انتہا پسندوں کی طرف سے ڈرانے

پاکستان

دھمکانے کے ماحول میں ہوئی اور ان حالات میں، عموماً عدالتوں نے انتقامی کارروائی اور خدائی فوجداروں کے ڈر سے، ملزمان کو ضمانت پر رہا کرنے یا بری کرنے سے انکار کر دیا۔ انتہاپسندوں کے ساتھ محاذ آرائی اور ان کے تشدد سے بچنے کے لیے، ججوں اور مجسٹریٹوں نے مقدمات کی سماعت میں تاخیر کی یا غیر معینہ مدت تک ان کی سماعت جاری رکھی۔ مذہبی تنظیموں اور انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں نے ان افراد کو سزائیں نہ دیے جانے پر تشویش کا اظہار کیا جنہوں نے توہینِ مذہب کے جھوٹے الزامات عائد کیے تھے۔ پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی قلیل آبادی پر توہینِ مذہب کے جتنے الزامات عائد کیے گئے، ان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ، جن لوگوں نے توہینِ مذہب کے جھوٹے الزامات لگائے، پولیس نے اکثر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی یا عدالتوں نے انہیں بری کر دیا۔

پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق، پولیس نے اس سال کے دوران، توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت 12 نئے مقدمے درج کیے اور عدالتوں نے تین افراد کو سزائے موت، چھ افراد کو عمر قید، اور تین افراد کو دو سال قید کی سزا دی۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ عدالتوں نے ایک فرد کو توہینِ مذہب کے الزام سے بری کر دیا، اور ایک اور فرد کی ضمانت منظور کر لی جو توہینِ مذہب کے الزام میں پانچ سال کی قید کاٹ چکا تھا۔

مبصرین نے یہ بات نوٹ کی کہ بہت سے افراد نے اکثر توہینِ مذہب کی شکایات اپنے ہمسایوں، ہم رتبہ لوگوں یا کاروباری ساتھیوں کے خلاف درج کرائیں، جن کا مقصد اپنے ذاتی جھگڑے چکانا یا ایسے کمزور لوگوں کو ڈرانا دھمکانا تھا، جو اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ قانون کے تحت ضروری ہے کہ کوئی شکایت درج کرنے سے پہلے پولیس کا کوئی اعلیٰ عہدے دار توہینِ مذہب کے الزام کی تفتیش کرے، لیکن پولیس نے اس شِق پر یکساں طور سے عمل نہیں کیا۔

اخباری اطلاعات کے مطابق، 20 فروری کو ایک عدالت نے لیاقت علی کی ضمانت کی چوتھی درخواست مسترد کر دی۔ اس پر 2013 میں توہینِ مذہب کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ علی اور علی کے مذہبی اتالیق پر توہینِ مذہب کا الزام تھا کیوں کہ انھوں نے مبینہ طور پر کلمۂ شہادت کو غلط طریقے سے پڑھا تھا۔ علی نے کہا کہ اس پر یہ الزام جائداد کے ایک جھگڑے کے بارے میں ذاتی عناد کی بنا پر لگایا گیا تھا۔

28 مارچ کو، ایک عدالت نے ساون مسیح کو توہینِ مذہب کے جرم میں موت کی سزا دی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بنا پر لاہور میں فساد ہو گیا تھا۔ عدالت نے مسیح کو جو عیسائی ہے، 2013 میں اپنے ایک مسلمان دوست کے ساتھ گفتگو میں توہینِ مذہب کے ارتکاب کا مجرم قرار دیا۔ جب مسیح کے خلاف الزامات سامنے آئے، تو 3,000 سے زیادہ افراد کے ایک ہجوم نے لاہور کی جوزف کالونی میں عیسائیوں کے تقریباً 100 گھروں کو جلا دیا۔ مسیح نے لاہور ہائی کورٹ میں ایک اپیل دائر کی جس میں کہا گیا تھا کہ الزامات جھوٹے تھے، اور ان کا مقصد اس علاقے سے عیسائیوں کو بے دخل کرنا تھا۔

پاکستان

3 اپریل کو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، پنجاب کی ایک عدالت نے ایک عیسائی جوڑے، شفقت ایمانوئل اور شگفتہ کوثر کو گوجرہ، پنجاب میں مقامی مسلمانوں کو ایسے ٹیکسٹ میسیج بھیجنے کے الزام میں جن سے توہینِ مذہب کا ارتکاب ہوا تھا، موت کی سزا سنائی۔ پولیس نے پہلی بار یہ کیس 2013 میں رجسٹر کیا تھا۔

11 جولائی کو، اسلام آباد کی انسدادِ دہشت گردی کی عدالت نے تحریکِ طالبانِ پاکستان (TTP) کے عسکریت پسندوں، حماد عادل اور محمد تنویر کی حراست کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ ان افراد نے، اگست 2013 میں اپنی گرفتاری کے بعد، مبینہ طور پر اعتراف کیا کہ انھوں نے 2011 میں، اقلیتی امور کے سابق وفاقی وزیر اور توہینِ مذہب کے قوانین کے شدید ناقد، شہباز بھٹی کو قتل کیا تھا۔ عادل اور تنویر ہی وہ دو افراد تھے جن پر اس قتل کا شبہ تھا۔ سال کے آخر تک یہ مقدمہ چل رہا تھا۔

16 اکتوبر کو، لاہور ہائی کورٹ نے آسیہ بی بی کی سزائے موت برقرار رکھی۔ یہ عیسائی عورت 2010 میں اس وقت سے پھانسی کی کوٹھڑی میں ہے، جب ایک ضلعی عدالت نے اسے کسی زبانی جھگڑے کے دوران پیغمبرِ اسلام کے بارے میں اہانت آمیز الفاظ استعمال کرنے کا مجرم قرار دیا تھا۔ 24 نومبر کو اس کے وکیلوں نے سپریم کورٹ میں ایک اپیل پیش کی۔

احمدیہ کمیونٹی کے مطابق، *1984* (جب "احمدی مخالف قوانین" کا نفاذ ہوا تھا) اور 2014 کے درمیانی عرصے میں، حکام نے 33 احمدیہ مسجدوں کو سیل کر دیا، اور 52 مسجدوں کی تعمیر پر پابندی لگا دی، جب کہ حملہ آوروں نے *28* احمدیہ مسجدوں کو مسمار کر دیا یا انہیں نقصان پہنچایا، 14 مسجدوں کو آگ لگا دی گئی، اور 19 مسجدوں پر زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔

مذہبی اقلیتوں کی کمیونٹیوں کے ارکان نے کہا کہ قانون، انصاف اور انسانی حقوق کی وفاقی وزارت، اور اس کی صوبائی شاخیں، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ مبصرین نے یہ بات نوٹ کی کہ وفاقی اور صوبائی دونوں سطحوں پر، مذہبی اقلیتوں کے لیے تحفظ کی فراہمی کے قوانین کے اطلاق اور ان پر عمل درآمد میں عدم یکسانیت، بدستور سنگین مسئلہ بنی رہی۔

19 جون کو، سپریم کورٹ نے حکومت کو حکم دیا کہ وہ ستمبر 2013 میں آل سینٹس چرچ پر بم کے حملے میں ہلاک اور زخمی ہونے والے افراد کے خاندانوں کو پورا معاوضہ ادا کرے۔ اس واقعے میں کم از کم 83 افراد ہلاک اور 146 سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ عدالت نے یہ بات نوٹ کی کہ حکومت نے ان خاندانوں کو مالی ہرجانہ ادا کرنے میں تاخیر کی تھی۔ چرچ نے اطلاع دی کہ متاثرہ خاندانوں کو سال کے آخر تک پورا معاوضہ ادا نہیں کیا گیا تھا۔

پاکستان

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلوں کے معاملے میں ہندوؤں، سکھوں اور احمدیوں کے خلاف امتیازی سلوک جاری رہا۔ اقلیتی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ان کی کمیونٹیوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے میں پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھ لیڈروں نے کہا کہ بعض صورتوں میں، سکھ طالب علموں کے لیے ضروری تھا کہ وہ متروکہ ٹرسٹ پراپرٹی بورڈ سے اجازت نامے کا سرٹیفیکٹ حاصل کریں جو اُن کے کہنے کے مطابق ایک ایسا لمبا کام تھا جس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں سکھوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں، بیشتر مذہبی اقلیتی گروپوں نے امتیازی سلوک کی شکایت کی۔ وفاقی اور صوبائی سطحوں کی ملازمتوں میں اگرچہ مذہبی اقلیتوں کے لیے 5 فیصد کا کوٹا مقرر ہے، لیکن ملازمتیں دینے والوں نے اس ضابطے پر باقاعدگی سے عمل درآمد نہیں کیا۔

سِول سروس کے اندر ترقیاں، بظاہر تمام اقلیتی گروپوں کے لیے محدود رہیں۔ بہت سی اقلیتوں کا موقف یہ تھا کہ ایک ایسی "شیشے کی چھت" ہے جو اعلیٰ عہدوں پر اُن کی ترقیوں میں حائل رہی۔ اگرچہ فوجی سروس میں اقلیتی مذہبی گروپ کے ارکان کی ترقی کی راہ میں سرکاری طور پر کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی، تاہم عملی طور پر غیر مسلموں کو شاذونادر ہی کرنل سے اوپر کسی عہدے پر ترقی دی گئی اور اُنہیں اکثر سیاسی طور پر حساس عہدوں پر مامور نہیں کیا گیا۔

جناح انسٹی ٹیوٹ اور دوسری تنظیموں کے مطابق، سرکاری اسکولوں کی نصابی کتابوں میں اقلیتی مذہبی گروپوں، خاص طور پر احمدیوں، ہندوؤں اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں توہین آمیز باتوں کا اندراج جاری رہا۔ مذہبی عدم رواداری کی تعلیم بہت عام تھی۔ انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیم، نیشنل کمیشن فار جسٹس اینڈ پیس کی 2013 کی ایک رپورٹ کے مطابق، اقلیتی گروپوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی بڑی وجہ اسکولوں کے نصاب میں پایا جانے والا نفرت انگیز مواد تھا۔ پنجاب اور سندھ میں 13-2012 کے تعلیمی سال کے دوران گریڈ 1 تا 10 میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں کی جانچ پڑتال سے پتہ چلا کہ نصاب میں ہندوؤں، عیسائیوں اور دوسری مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیازی اور اشتعال انگیز مواد شامل تھا۔

تمام وفاق ایسی تعلیمات کو ختم کر دینے کے منشور پر کام کرتے رہے جن سے مذہبی یا فرقہ وارانہ عدم رواداری کو اور مدرسوں میں دہشت گرد یا انتہا پسند عناصر کی بھرتی کو فروغ ملتا ہو۔ تعلیمی بورڈوں کے انسپکٹروں نے ایسے تمام ملحقہ مدرسوں کے لیے جن میں کل وقتی طالب علم ہیں، مذہبی مضامین کے ساتھ سیکولر مضامین کی تعلیم لازمی قرار دی۔

سوائے احمدیوں کے، مذہبی اقلیتوں کے لیے ان کی مذہبی کتابیں عموماً آزادی سے درآمد کی گئیں۔

پاکستان

حکومت نے حج کے سفر کے لیے مسلمانوں کو رقوم اور سہولتیں فراہم کیں، لیکن مذہبی اقلیتوں کے زائرین کے لیے اس قسم کے کوئی پروگرام نہیں بنائے گئے۔ پاسپورٹ کی دستاویز میں چونکہ مذہبی وابستگی درج کرنے اور احمدیوں کے پیغمبر کی مذمت کرنے کا تقاضہ کیا جاتا ہے، اس لیے احمدی حج میں شرکت نہیں کر سکے کیونکہ انہیں خود کو مسلمان کہنے کی ممانعت ہے۔

حکومت اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی، اس لیے پاکستانی شہریوں کو، اس بات سے قطع نظر کہ وہ کس مذہب سے وابستہ ہیں، اسرائیل کا سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس چیز نے خاص طور پر بہائیوں کو متاثر کیا کیوں کہ بہائیوں کا ورلڈ سینٹر، جو ان لوگوں کا روحانی اور انتظامی مرکز ہے، اسرائیل میں واقع ہے۔

سپریم کورٹ نے ٹنڈو آدم، سندھ میں اُن ہندوؤں کے ایک مقدمے کے بارے میں، جنہیں مبینہ طور پر کسی مندر میں جانے سے روک دیا گیا تھا، اپنے 23 فروری کے اقدام کے بعد، 20 جون کو اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں ایک تفصیلی فیصلے کا اعلان کیا۔ عدالت نے وفاقی حکومت کو ہدایت کی کہ وہ ملک میں اقلیتوں کی سلامتی اور تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ایک ٹاسک فورس قائم کرے، مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے حکمت عملی وضع کرے، اور مذہبی اور ثقافتی رواداری کے فروغ کے لیے اسکول کے نصابوں کا جائزہ لے۔ عدالت نے وفاقی حکومت کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ سوشل میڈیا میں نفرت انگیز بیانات کی حوصلہ شکنی کے لیے اقدامات کرے، اور خلاف ورزی کرنے والے ملزموں کو انصاف کے کٹھرے تک لائے۔ عدالت نے حکومت سے یہ بھی کہا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے ایک قومی کونسل قائم کرے۔ 14 جولائی کو، حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اقلیتوں کے لیے ایک قومی کمیشن قائم کرے گی جس میں عیسائی، ہندو، مسلمان اور سکھ نمائندے شامل ہوں گے۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق، حکومت نے اس اعلان پر عمل کیا، اور کمیشن کے ارکان کی پہلی میٹنگ 13 نومبر کو منعقد ہوئی۔

باغی یا غیر ملکی فوجوں یا دہشت گرد تنظیموں کے ہاتھوں حقوق کی پامالی

ایسے افراد یا تنظیموں کے ہاتھوں، جنہیں امریکی حکومت نے دہشت گرد تنظیمیں قرار دیا ہے، اور لشکرِ جھنگوی، تحریکِ طالبانِ پاکستان، اور سپہ صحابہ سمیت اسی قسم کی تنظیموں سے قریبی تعلق رکھنے والے مسلح فرقہ پرست اور انتہا پسند لوگوں کے ہاتھوں، مذہبی گروپوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعدد واقعات ہوئے۔

ممتاز شیعہ شخصیتوں کے خلاف مسلسل حملے ہوتے رہے۔ سندھ میں شیعوں پر حملوں کے بارے میں ایک پبلک ڈیٹا بیس میں اطلاع دی گئی کہ سال کے دوران، 141 الگ الگ حملوں میں 139 افراد ہلاک اور 49 زخمی ہوئے۔

پاکستان

متشدد سُنّی اور شیعہ انتہاپسندوں کے درمیان فرقہ وارانہ تشدد جاری رہا، اور مذہبی اقلیت سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد اور کمیونٹیوں کو ملک بھر میں مذہب کی بنیاد پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ شیعہ اقلیت پر خاص طور سے ڈیرہ اسمٰعیل خان، کوئٹہ، ہنگو، کوہاٹ، ٹانک، ڈیرہ غازی خان، گلگت، اور کرم اور اورکزئی ایجنسیوں میں حملے جاری رہے۔ فرقہ پرست، متشدد انتہاپسند اور دہشت گرد گروپوں کے ہاتھوں عبادت گاہوں، مذہبی اجتماعات، اور مذہبی لیڈروں پر حملوں کے نتیجے میں، سال کے دوران سینکڑوں اموات ہوئیں۔

ہزارہ نسل کے لوگوں کو، جن کی بھاری اکثریت شیعہ ہے، خاص طور سے پُر تشدد حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہیومن رائٹس واچ نے اطلاع دی کہ 2008 سے اب تک، 500 سے زیادہ ہزارہ نسل کے لوگوں کو ہلاک کیا جا چکا ہے۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے اطلاع دی کہ تشدد سے بچنے کے لیے، گذشتہ پانچ برسوں میں ہزارہ نسل کے تقریباً 30,000 افراد بلوچستان سے نقلِ مکانی کر گئے ہیں۔ لشکرِ جھنگوی نے بلوچستان کے ضلع مستونگ میں 21 جنوری کو ایک بس پر جو ہزارہ شیعہ زائرین کو لے کر جا رہی تھی، بم کے ایک خودکش حملے کی ذمے داری کا دعویٰ کیا۔ اس حملے میں 24 افراد ہلاک اور 40 زخمی ہوئے۔ 4 اکتوبر کو کوئٹہ کے ہزارہ ٹاؤن کے ایک عید بازار میں بم کے ایک خودکش حملے میں پانچ افراد ہلاک اور 20 سے زیادہ زخمی ہو گئے۔ 23 اکتوبر کو ایک مسلح شخص نے ہزارہ تاجروں کی ایک بس پر جو کوئٹہ میں ایک سبزی منڈی کی طرف جا رہی تھی، گولیاں چلائیں اور آٹھ افراد کو ہلاک کر دیا۔

متشدد انتہاپسندوں نے مذہبی اقلیتوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے سوشل میڈیا کو بھی استعمال کیا۔ 2 فروری کو، تحریکِ طالبانِ پاکستان نے ایک وڈیو جاری کیا جس میں خیبر پختونخواہ میں دو اقلیتی گروپوں، کالاش اور اسمٰعیلیوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انھوں نے تحریکِ طالبانِ پاکستان کے عقیدے کے مطابق اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، تو انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس وڈیو کو آئین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے، اس وقت کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے خیبر پختونخواہ کی صوبائی حکومت کو ہدایت کی کہ وہ کالاش کو تحفظ کی فراہمی کے بارے میں رپورٹ پیش کریں۔ خیبر پختونخواہ کی حکومت نے 13 مارچ کو اس حکم کی تعمیل میں ایک رپورٹ پیش کی جس میں بتایا گیا تھا کہ نفاذِ قانون کی ایجنسیاں کس طرح علاقے میں سیکیورٹی کے انتظامات میں اضافہ کریں گی۔

سیکشن III۔ معاشرے میں مذہبی آزادی کے لیے احترام کی صورتِ حال

پورے سال قاتلوں نے شیعوں، سکھوں اور احمدیوں پر گھات لگا کر حملے کیے اور انہیں ہلاک کیا۔ توہینِ مذہب کے الزامات کے نتیجے میں بعض اوقات ہجوم نے تشدد کیا اور ملزم کو ہلاک کر دیا۔ شہریوں نے اکثر توہینِ مذہب کے قوانین کو مذہبی اقلیتوں اور ایسے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے، جن پر آسانی سے الزام لگایا جا سکتا تھا، اور ذاتی یا کاروباری رقیبوں سے بدلے چُکانے کے لیے استعمال کیا۔ معاشرتی عناصر نے احمدیوں کے حقوق کی پامالی اور

پاکستان

ان کے خلاف امتیازی سلوک کا جواز پیدا کرنے کے لیے تعزیری قوانین کی ان شقوں کو بھی استعمال کیا جو "احمدیوں کے خلاف" ہیں۔ انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کے سرگرم کارکنوں اور اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بتایا کہ عدم رواداری اور خوف وہراس کے ماحول کی وجہ سے انہیں بعض اوقات مذہبی رواداری کے حق میں آواز بلند کرنے میں پس وپیش ہوتا تھا۔

بعض مذہبی لیڈروں نے مذہبی اقلیتوں پر حملوں کی مذمت کی۔ اقلیتوں کے حقوق کے موضوع پر ایک 2-روزہ ورکشاپ کے دوران، سنّی بریلوی لیڈروں نے علما اور مساجد کے اماموں پر زور دیا کہ وہ مذہبی ہم آہنگی کی فضا تیار کریں اور معاشرے کے تمام اجزاء کے درمیان بقائے باہمی کی حوصلہ افزائی کریں۔ اسی تقریب میں، لاہور کی جامعہ نعیمیہ یونیورسٹی کے پرنسپل، راغب حسین نعیمی نے مذہبی عالموں پر زور دیا کہ وہ انسانی حقوق کی اہمیت کو اجاگر کریں۔

8 مئی کو، ملتان، پنجاب میں کسی نامعلوم مسلح شخص نے راشد رحمٰن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انھوں نے پولیس کو خبردار کر دیا تھا کہ انہیں اس دوران جبکہ وہ ایک یونیورسٹی لکچرر جنید حفیظ کا دفاع کر رہے تھے، جن پر توہینِ مذہب کا الزام عائد کیا گیا تھا، موت کی دھمکیاں وصول ہو رہی تھیں۔ ان کے قتل ہو جانے سے پہلے، عدالت میں اس کیس کی ایک سماعت کے موقعے پر، دو وکیلوں اور دو دوسرے افراد نے مبینہ طور پر رحمٰن کو دھمکی دی تھی، اور ان سے کہا تھا کہ وہ عدالت کی اگلی سماعت میں پیش ہونے کے لیے "موجود نہیں ہوں گے۔" رحمٰن کے قتل کے سلسلے میں کوئی گرفتاریاں نہیں کی گئیں۔ 4 دسمبر کو، مسلح افراد نے حفیظ کے نئے وکیل، شہباز گورمانی کی رہائش گاہ پر گولیاں چلائیں اور وہاں ایک خط چھوڑ گئے جس میں انہیں انتباہ کیا گیا تھا کہ وہ اس کیس سے دستبردار ہو جائیں۔

4 نومبر کو، کوٹ رادھا کشن، پنجاب میں، تقریباً 1,500 دیہاتیوں کے ایک ہجوم نے ایک عیسائی جوڑے پر توہینِ مذہب کا الزام لگایا اور انہیں اینٹوں کے ایک بھٹّے میں زندہ جلا دیا۔ میڈیا، سرکاری اور سول سوسائٹی کی تنظیموں نے اطلاع دی کہ بھٹے کے مالک نے اس جوڑے پر قرآن کی بے حرمتی کا الزام اس وقت عائد کیا جب وہ ایک قرض کی ادائیگی نہ کر سکا تھا۔ بھٹے کے مالک نے انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا اور اس دوران مقامی مسجدوں سے ہجوم کو اکٹھا کرنے کے لیے اعلانات کیے گئے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق، پولیس نے 59 مشتبہ ملزموں کو گرفتار کر لیا اور مزید 468 افراد کے خلاف مقدمے درج کر لیے۔ سیاسی اور مذہبی لیڈروں نے اس حملے کی مذمت کی، اور وزیرِ اعظم اور پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ دونوں نے مقتولین کے لیے انصاف کا مطالبہ کیا۔ 16 دسمبر کو، سپریم کورٹ نے اس واقعے کے بارے میں پولیس کی رپورٹ مسترد کر دی اور اسے نامکمل قرار دیا۔ عدالت نے حکم دیا کہ پولیس کے اس عملے کے خلاف جو حملے کے وقت موجود تھا، فرائض کی انجام دہی سے غفلت برتنے کے الزام میں کارروائی کی جائے۔

احمدیہ کمیونٹی نے اطلاع دی کہ حملہ آوروں نے 10 احمدیوں کو ان کے مذہب کی بنیاد پر قتل کر دیا۔ 16 مئی کو، مقامی میڈیا نے اطلاع دی کہ شرقپور،

پاکستان

پنجاب میں، ایک نوجوان ایک پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا اور اس نے ایک احمدی، خلیل احمد کو جس پر توہینِ مذہب کا الزام تھا، گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 26 مئی کو، دو نامعلوم افراد نے امراضِ قلب کے ماہر سرجن مہدی علی قمر کو، ایک احمدیہ قبرستان میں، گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 27 جولائی کو، ان الزامات کے بعد کہ ایک احمدی ثاقب دین نے گوجرانوالہ، پنجاب میں، توہینِ مذہب کا ارتکاب کیا تھا، ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ہجوم نے ایک گھر کو آگ لگا دی۔ اس واقعے میں ایک عورت، بشیرن بی بی، اور دو بچے ہلاک اور نو دوسرے افراد زخمی ہو گئے۔

شیعوں کے خلاف تشدد جاری رہا۔ 20 جنوری کو، پشاور میں، دو مسلح افراد نے شیعہ عالم، علامہ علیم کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 28 فروری کو، کراچی میں، ایک مسلح شخص نے ممتاز مذہبی عالم علامہ سید تقی ہادی نقوی سمیت، نو شیعوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 8 جون کو، خلاف قانون تنظیم جیش الاسلام نے ایران سے واپس آنے والے شیعہ زائرین پر حملے کی ذمہ داری کا دعویٰ کیا۔ اس حملے میں تافتان، بلوچستان میں، 30 شیعہ ہلاک ہوئے۔ 24 جولائی کو، دو افراد نے ایبٹ آباد میں مصطفیٰ شیرازی اور ان کے بیٹے، وسیم شیرازی کو ہلاک کر دیا۔ اسی روز کسی مسلح فرد نے کراچی میں شیعہ سینیئر وکیل سید مبارک رضا کاظمی کو، جو ممتاز شیعہ عالم علامہ طالب جوہری کے داماد تھے، گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

پورے سال کے دوران، متشدد انتہا پسند عناصر نے ذکری مسلمانوں اور ہندو کمیونٹیوں سے تعلق رکھنے والی مذہبی اقلیتوں کو بھی چُن چُن کر ہلاک کیا۔ یکم جولائی کو، نامعلوم مسلح افراد نے مقامی ہندو ایسوسی ایشن کے صدر بھگوان داس کو خضدار، بلوچستان میں اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ اپنی دوکان کھول رہے تھے۔ 29 جولائی کو، ڈان نیوز نے اطلاع دی کہ سات افراد اس وقت زخمی ہو گئے جب بلوچستان کے ضلع خضدار میں ذکری زائرین کو لے جانے والی ایک بس کو دور فاصلے سے بم کے دھماکے سے تباہ کر دیا گیا۔

پورے سال کے دوران، مسلح افراد نے کئی سکھوں کو نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا۔ 23 جنوری کو، دو مسلح افراد نے ٹانگی بازار، بلوچستان میں، ایک سکھ دوکاندار بھگوان سنگھ کو ہلاک کر دیا۔ 6 ستمبر کو ڈان نیوز نے اطلاع دی کہ نامعلوم حملہ آوروں نے نوتھیا بازار، پشاور میں، ہرجیت سنگھ کو اس کے دوکان کے اندر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

معاشرے کے عناصر کے ہاتھوں، مذہبی اقلیتوں کو زبردستی مسلمان بنائے جانے کے واقعات بھی ہوئے۔ مذہبی اقلیتوں نے اس صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا کہ معاشرتی عناصر کے ہاتھوں مذہبی اقلیتوں کو جبراً مسلمان بنائے جانے پر حکومت کی طرف سے یا تو کوئی کارروائی نہیں کی گئی یا ناکافی اقدامات کیے گئے۔ نیشنل کمیشن فار جسٹس اینڈ پیس کے مطابق، پاکستان میں ہر سال 1,000 عیسائی اور ہندو عورتوں کو انہیں اغوا کرنے والے یا جرائم پیشہ افراد اپنا مذہب تبدیل کرنے اور مسلمان مردوں سے شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ موومنٹ فار سالیڈیریٹی اینڈ پیس ان پاکستان کی ایک رپورٹ کے مطابق، ان میں سے 700 عورتیں عیسائی اور 300 ہندو ہوتی ہیں۔ 4 مارچ کو، محمد اسلم اور حملہ آوروں کے ایک گروپ نے ایک عیسائی

پاکستان

لڑکی، 15 سالہ کومل یوسف کو اغوا کیا اور اسے اسلم سے شادی کرنے پر مجبور کیا۔ اغوا کے بعد، کومل یوسف کے والدین نے مجرموں کے خلاف ایک کیس درج کرایا لیکن پولیس نے یہ کہہ کر کیس رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا کہ لڑکی نے رضاکارانہ طور پر اسلام قبول کیا تھا اور اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ ایک غیر سرکاری تنظیم اور ایک مسلمان وکیل نے اغوا کنندگان سے لڑکی کی رہائی حاصل کرنے میں گھرانے کی مدد کی۔ معاشرے کے منفی ردِ عمل سے بچنے کے لیے، لوگ اقلیتی مذاہب کو عام طور سے خفیہ طور پر اختیار کرتے ہیں۔

اقلیتوں کے مقدس مقامات، قبرستانوں اور مذہبی علامات پر ایسے حملوں کی متعدد اطلاعات ملیں جن میں پولیس ان حملوں کو روکنے میں ناکام رہی۔ 10 فروری کو، حملہ آوروں نے بلوچستان کے ایک مقبول صوفی شاعر مست توکلی کے مزار کو آگ لگادی۔

16 مارچ کو، کسی ہندو کے ہاتھوں قرآن کی مبینہ بے حرمتی کے جواب میں، ایک گروپ نے لاڑکانہ میں ایک ہندو مندر پر حملہ کیا اور اسے آگ لگادی۔ اس گروپ نے فرنیچر، مجسموں اور دوسری مذہبی اشیاء کو آگ لگادی۔ پولیس نے بتایا کہ اس نے اس کارروائی میں ملوث لوگوں کو گرفتار کر لیا۔

اس واقعے کے بعد، ہندو کمیونٹی کے سینکڑوں لوگوں، اور انسانی حقوق کے کچھ سرگرم کارکنوں نے پولیس کی طرف سے زیادہ تحفظ کا مطالبہ کرنے کے لیے مظاہرہ کیا۔ 20 مارچ کو، سپریم کورٹ نے مندر پر حملوں کی تفتیش کے لیے لاڑکانہ کے ایک جج کا تقرر کیا۔ وزیرِ اعظم نواز شریف نے بھی، 17 مارچ کو اعلان کیا کہ اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔

روزگار کے معاملے میں عیسائیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر امتیازی سلوک کیا جاتا رہا۔ عیسائیوں کو ادنیٰ درجے کے جسمانی محنت کے چھوٹے موٹے کاموں کے سوا دوسری ملازمتیں حاصل کرنے میں دشواری ہوتی تھی، تاہم عیسائی کارکنوں نے بتایا کہ حالیہ برسوں کے دوران، نجی شعبے میں اور فوج میں، حالات میں کچھ بہتری آئی ہے۔

مبصرین نے بتایا کہ مذہبی اقلیتوں کو درپیش مسائل کے بارے میں میڈیا کے کوریج میں عام طور سے بہتری آئی ہے۔ تاہم، ایسی مثالیں بھی تھیں جب میڈیا نے، اقلیتوں کے بارے میں اشتعال انگیز بیانات یا نامناسب حوالوں کو استعمال کیا۔ مثال کے طور پر، 22 دسمبر کو، مذہبی شخصیت سید عارف شاہ اویسی نے جیو ٹی وی کے ایک ٹاک شو میں مہمان کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے، احمدیوں کے لیے "پاکستان کے دشمن" کے الفاظ استعمال کیے۔ اس شو کے پانچ دن بعد، مسلح افراد نے پنجاب میں گوجرانوالہ کے نزدیک، احمدیہ کمیونٹی کے ایک رکن لقمان احد شہزاد کو ہلاک کر دیا۔ اگرچہ ان دو واقعات کے درمیان بظاہر کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا، جیو ٹی وی نے ایک معذرت نامہ جاری کیا اور نشاندہی کی کہ اس مذہبی شخصیت کے کلمات سے جیو نیٹ ورک کے ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی ہوئی تھی۔

پاکستان

بہت سے مبصرین نے اتفاق کیا کہ مذہبی اقلیتوں کے بارے میں اطلاعات دینے کے معاملے میں، صحافیوں کو زیادہ تربیت کی ضرورت ہے۔

مذہبی اقلیتوں کے لیڈروں نے کہا کہ حکومت اینٹوں کے بھٹوں اور زرعی شعبے میں کام کرنے والی اقلیتوں کو قرض کے بوجھ تلے جبری محنت سے تحفظ فراہم کرنے کے کافی اقدامات کرنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ ایک غیر قانونی طریقہ ہے جس سے متاثر ہونے والے عیسائی اور ہندو مزدوروں کی تعداد ان کے آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔

سیکشن IV۔ امریکی حکومت کی پالیسی

مئی میں، امریکہ کے نائب وزیرِ خارجہ نے ملک کا دورہ کیا اور سرکاری عہدے داروں کے ساتھ میٹنگوں میں فرقہ وارانہ تشدد اور توہینِ مذہب کے قوانین سمیت مذہبی آزادی کے مسائل پر بات چیت کی۔ افغانستان اور پاکستان کے لیے محکمۂ خارجہ کے خصوصی نمائندے کے پرنسپل نائب نے فروری اور جولائی میں ملک کا دورہ کیا اور دونوں موقعوں پر حکومت کے وزراء، دوسرے اعلیٰ عہدے داروں، اور سول سوسائٹی کے ساتھ گفتگو میں مذہبی آزادی کے معاملے کو اٹھایا۔

امریکی سفیر اور کونسلز جنرل، اور دوروں پر آئے ہوئے محکمۂ خارجہ کے افسروں سمیت، سفارت خانے کے اعلیٰ عہدے داروں نے حکومت کے عہدے داروں اور تمام مذہبی گروپوں کے کمیونٹی لیڈروں اور مذہبی آزادی کے مسائل پر کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ میٹنگوں میں شرکت کی اور ایسی میٹنگوں کی میزبانی بھی کی۔ ان میٹنگوں میں بین المذاہب مکالمے، مذہبی رواداری اور مذہبی آزادی کے مسائل پر غور وخوض کیا گیا۔ سفارت خانے کے عہدے داروں نے ان گروپوں کے ساتھ مل کر ایسے پروگراموں اور منصوبوں کا جائزہ بھی لیا جن سے مذہبی رواداری کو فروغ دیا جاسکے۔

اپریل میں اسلامی تعاون کی تنظیم کے لیے امریکہ کے خصوصی سفیر نے ملک کا دورہ کیا جہاں انھوں نے مسلمانوں کے اقلیتی گروپوں اور عیسائی کمیونٹیوں سمیت، مذہبی آزادی کو ترجیحی درجہ دینے کی اہمیت پر سرکاری عہدے داروں، اور تمام مذہبی پس منظر والے مذہبی لیڈروں، علمی شخصیتوں، اور سول سوسائٹی کے لیڈروں کے ساتھ میٹنگیں کیں۔ انھوں نے مذہبی اقلیتوں کی آبادیوں پر توہینِ مذہب کے قوانین کے منفی اثر پر اظہارِ خیال کیا اور یہ دلیل دی کہ تقریر پر اس قسم کی پابندیاں مسلمان آبادیوں اور ملک کے لیے نقصان دہ ہیں۔

مئی میں امریکی سفیر نے مختلف اسلامی گروپوں اور دوسرے مذاہب کی نمائندگی کرنے والے مذہبی اور سول سوسائٹی کے لیڈروں کے ایک متنوع

پاکستان

مجموعے، انٹر فیتھ اڈوائزری گروپ کا افتتاحی اجلاس منعقد کیا۔ اس گروپ نے سفارت خانے کی ان جاری کوششوں پر تبادلہ خیال کیا جن کا مقصد مذہبی لیڈروں کو ایسے پروگراموں میں شامل کرنا ہے جن کا مقصد متشدد انتہاپسندی کا توڑ کرنا، اور مذہب کے اظہار کے زیادہ اجتماعی اور روادار پیرایوں کو فروغ دینا ہے۔

نومبر میں کوٹ رادھا کشن میں کرسچین جوڑے کی ہلاکت کے بعد، امریکی سفیر نے مذہبی عدم رواداری اور ہجوم کے تشدد کی مذمت میں ایک بیان جاری کیا۔